Presented by. Dr.Shahab Zafar Azmi, Associate Professor

Department of Urdu Patna University.Patna

Mob;8863968168 Email;drshahabzafar.azmi@gmail.com

سبق کے خدوخال

0 مقصد

1 تعارُف

2 غالبؔ کے سوانحی حالات

3 غالب کی تصانیف

4 اقسامِ کلام غالبؔ

5 غالبؔ کا مرتبہ بحیثیت شاعر

6 غالبؔ اور تصوف

7 غالب اور اُن کے معاصرین کا موازنہ

8 خلاصہ

9 مشق کے لئے سوالات

10 مزید مطالعہ کے لئے کتابیں

0 مقصد

غالبؔ اردو کے عظیم شاعروں میں سے ایک ہیں۔ انہوں نے اردو شاعری کو پہلی بار حدیث دلبری کہ جگہ حکایت زندگی سے آشنا کیا۔ غالبؔ کا مختصر سا دیوان جسے ایک ناقد نے الہامی کتاب قرار دیا تھا، ایسا محشر خیال ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ اِس اکائی کا مقصد اسی صاحب طرز شاعر اور دلکش شخصیت کی زندگی اور شاعری سے طلبہ کو واقفیت بہم پہنچانا ہے۔

1 موضوع کا تعارف

غالبؔ کو اردو کا سب سے اہم غزل گو شاعر مانا جاتا ہے۔ انہیں ہم میرؔ و سوداؔ کا ہم عصر تو نہیں قرار دے سکتے مگر اردو شاعری کے عہد متوسط میں میرؔ و سوداؔ کے ساتھ ضرور شریک کر سکتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اردو شاعری کا کلاسیکی عہد میرؔ سے قبل ختم ہو چکا تھا اور اس کے عہد جدید کا آغاز غالبؔ کے فوراً بعد ہوتا ہے۔ اس لیے غالب وہ اہم ترین کڑی ہے جو اردو شاعری کے عہد متوسط اور عہد جدید کو جوڑنے کا کام کرتی ہے۔ غالبؔ نے اپنے عہد کی بہت ساری مروج روایتوں سے انحراف کیا ہے اور بعض کی پابندی بھی کی ہے۔ مگر ان کا سب بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اردو غزل کو عشق و محبت کی فرسودہ دنیا سے باہر نکال کر زندگی کی دوسری سچائیوں کا سامانا کرنا سکھایا ہے۔ شاید اسی لیے غالبؔ کا کلام کی معنویت آج بھی برقرار ہے اور ان کا یہ دعویٰ سچ ثابت ہوا ہے کہ۔

ہوں گرمیٔ نشاط تصور سے نغمہ سنج　　میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

ایک ایسے اہم شاعر کے بارے میں کچھ لکھنا، جس کی اہمیت کا عام طور سے اعتراف کیا جاتا ہے، بے حد مشکل ہے۔ ظاہر ہے کہ غالبؔ کی شاعری کے بارے میں مختلف جہتوں سے لکھی ہوئی سیکڑوں کتابیں اور ہزارون مضامین موجود ہیں۔ اس کے باوجود طالب علموں کے لیے غالبؔ کے شاعرانہ امتیازات، ان کی شاعری پہ شخصیت اور ماحول کے اثرات اور ان کی غزل گوئی کے مختلف جہات سے تعارف ضروری ہے تاکہ وہ غالبؔ جیسے عظیم شاعر کو اپنے طور جیسہ سمجھنے اور سمجھانے کے اہل بن سکیں۔

2　غالبؔ کے سوانحی حالات

نام میرزا اسداللہ خاں عرفیت میرزا نوشہ، خطاب نجم الدولہ، دبیر الملک بہادر نظامِ جنگ، تخلص شروع میں اسدؔ اور پھر غالبؔ اختیار کیا۔ مرزا صاحب کے آبا و اجداد ایبک قوم کے تُرک تھے۔ ان کا سلسلہ نسب تو رابنِ فریدوں تک پہونچتا ہے۔ سلجوقی سلطنت تباہ ہو جانے کے بعد اس خاندان کے ایک شہزادہ ترسمؔ خاں نے سمرقند میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ غالبؔ کے دادا اسی شہزادے کی اولاد میں سے تھے اور شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں ہندوستان چلے آئے تھے۔ یہاں آ کر بہت مفرز منصب اور پہاسو (ضلع بلند شہر) کا زرخیز علاقہ جاگیر میں پایا ان کے کئی بیٹے تھے۔ دو کے نام تحقیق ہو چکے ہیں۔ ایک غالبؔ کے والد عبداللہ بیگ خاں عشرف میرزا دولھا اور دوسرے نصر اللہ بیگ خاں عبداللہ بیگ خاں دلّی میں پیدا ہوئے اور ان کی شاری آگرہ میں خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کی دختر نیک اختر عزّت النساء سے ہوئی۔ خواجہ صاحب ایک مفرز فوجی افسر اور شرفائے آگرہ میں سے تھے۔ یہیں بتاریخ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ ہجری مطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء مرزا اسداللہ خاں غالبؔ پیدا ہوئے۔

غالبؔ کے والد پہلے لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ کے یہاں نوکر تھے۔ پھر حیدرآباد دکن میں تین سو سواروں کی جمیت سے کئی سال تک ملازم رہے۔ بعد کو ریاست الور میں ملازمت کی وہیں ۱۸۰۱ء میں ایک گڑھی کے زمیندار سے مقابلہ کرتے ہوئے گولی کھا کر انتقال کیا۔ رئیس الورؔ نے مرزا مرحوم کے دونوں لڑکوں (غالبؔ اور ان کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف خاں جو ایّام شباب میں مجنون ہو گئے تھے اور ۱۸۵۷ء میں انتقال کیا) کی پرورش کے لئے دو گاؤں اور کچھ روپیہ مقرر کر دیا جو تھوڑے دنوں تک جاری رہا۔

غالبؔ کے سر سے باپ کا سایہ اٹھا تو ان کی عمر تین چار سال کے درمیان تھی۔ ان کے چچا نصر اللہ بیگ خاں (جو سرکاری فوج میں

رسالدار تھے) نے دونوں بھتیجوں کی پرورش اپنے ذمہ لی لیکن پانچ سال بعد وہ بھی کسی معرکہ میں کام آ گئے اور تقریباً نو برس کی عمر میں غالبؔ بالکل بے یارو مددگار رہ گئے۔ چچا کے انتقال کے بعد مرحوم کی جاگیر کے معاوضہ میں سات سو روپے سالانہ پنشن مرزا غالبؔ آخر وقت تک پاتے رہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد تین برس تک وہ پنشن بند رہی لیکن نواب صاحب رام پور کی سفارش سے پھر جاری ہوگئی۔

تعلیم وتربیت

مرزا صاحب نو برس کے سن مین سر پرستوں سے محروم ہو گئے تھے۔اس لئے تعلیم کا کوئی اعلیٰ انتظام تو نہ ہوسکا تاہم ابتدائی تعلیم آگرہ کے نامور معلّم شیخ منظمؔ سے حاصل کی اور تمام کتب متداولہ پر عبور حاصل کرلیا۔ چودہ برس کی عمر تھی کہ ۱۲۲۶ھ مطابق ۱۸۱۱ء میں ایک پارسی نومسلم عبدالصمد اِیران سے ہندوستان آئے تو مرزا نے انھیں دو برس تک اپنے پاس ٹھہرایا اور ان کی صحبت میں فارسی زبان و ادب کا بڑا پاکیزہ ذوق پیدا کیا۔شعر گوئی پہلے ہی شروع کر چکے تھے اور مرزا بیدلؔ کے رنگ میں مشقِ سخن کیا کرتے تھے۔

شادی اور سکونتِ دہلی

مرزا کا عقد بعمر تیرہ سال نواب فخر الدولہ کے چھوٹے بھائی مرزا الٰہی بخش خاں معروفؔ کی دختر اُمراؤ بیگم سے دہلی میں ۷ ؍رجب مطابق ۹ ؍اگست ۱۸۱۰ء کو ہو چکا تھا۔اس تقریب سے ان کی آمدورفت دلّی میں زیادہ ہوگئی آخر کار یہیں سکونت اختیار کرلی اور مرتے دم تک دلّی ہی میں رہے۔

مالی پریشانیوں کے سلسلہ میں لکھنؤ، بنارس،کلکتہ اور ریاستِ رام پور کا سفر

مالی پریشانیوں سے تنگ آ کر ایک رشتہ دار کے خلاف مقدمہ دائر کرنے کے لئے مرزا کلکتہ کے قصبہ سے ۱۸۲۶ء میں دلی سے روانہ ہوئے اور کانپور پہنچے تو لکھنؤ کے بعض ذمی اقتدار عمائدین کے اصرار پر لکھنؤ بھی جانا پڑا۔انھوں نے بڑی مارت کی اور نصیر الدین حیدر فرمانروائے لکھنؤ کے نائب السلطنت روشن الدولہ سے ملانا چاہا۔لیکن مرزا صاحب نے دو شرطیں پیش کیں جو منظور نہ ہوئیں۔اس سے مرزا صاحب کی خودداری پر روشنی پڑتی ہے۔ایک شرط تو یہ تھی کہ نائب السلطنت میری تعظیم دیں دوسرے نذر سے مجھے معاف رکھا جائے۔ چنانچہ ان سے ملے بغیر مرزا صاحب ۴ ؍شعبان ۱۲۴۲ھ ہجری مطابق ۱۹ ؍جنوری ۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہنچے اور ایک سال نو ماہ تک وہیں مقیم رہے۔اس سفر میں آمدورفت اور لکھنؤ، بنارس اور کلکتہ کے قیام میں تین سال تین ماہ صرف ہوئے۔اور ناکام واپس آنا پڑا۔دلّی پہنچ کر کسی دوست کے توسط سے نصیر الدین حیدر کی خدمت میں ایک قصیدہ روانہ کیا جس کے صلے میں پانچ ہزار روپے دیئے جانے کا حکم ہوا۔ان میں سے تین ہزار روشنؔ الدولہ نے غصب کر لیئے اور دو ہزار مرزا صاحب کے دوست کو دے کر کہا کہ اس مین سے جو چاہو مرزا صاحب کو بھیجدو۔شیخ ناسخؔ نے مرزا صاحب کو اطلاع دی تو انھوں نے پھر کچھ تحریک کی لیکن تین دن بعد نصیر الدین حیدر کا انتقال ہوگیا۔آ کر واجد علی شاہ کے زمانہ میں پانچ سو روپیہ سالانہ مقرر ہو گئے۔لیکن دو سال بعد اودھ کی حکومت ہی ختم ہوگئی۔

۱۸۵۴ء میں ذوقؔ کا انتقال ہوجانے پر بادشاہ (بہادر شاہ ظفرؔ) نے اپنا کلام مرزا صاحب کو دکھانا شروع کیا اور دیگر شہادے بھی شاگرد ہوئے۔ مالی حالت میں بہتری کا آغاز ہی ہوا تھا کہ مئی ۱۸۵۷ء سے سرکاری پنشن بند ہوگئی اور مرزا صاحب گھر کے برتن اور کپڑے بیچ بیچ کر گذر کرتے رہے۔ حالت نا قابلِ برداشت حد تک پہنچ چکی تھی کہ ۱۶/جولائی ۱۸۵۹ء سے نواب رام پور (یوسف علی خاں جو مرزا صاحب کے شاگرد بھی تھے) نے سو روپیہ مشاہرہ مقرر کر دیا جو مرتے دم تک ملتا رہا۔ یہ رقم گذارہ کے لئے کافی نہیں تھی۔ چنانچہ مرزا صاحب ۱۹/جنوری ۱۸۶۰ء کو دہلی سے روانہ ہوکر ۲۷/جنوری کو رام پور پہنچے اور نواب صاحب سے سرکاری پنشن کی بحالی کے متعلق کوشش کرنے کے لئے کہا سنا۔ وہاں سے ۱۷/مارچ کو چل کر ۲۴/مارچ ۱۸۶۰ء کو تقریباً تین مہینے بعد دلی واپس آئے۔ اسی مہینے سے پینشن پھر جاری ہوگئی اور مارچ ۱۸۶۳ء سے دربار و خلعت کا منصب بھی بحال ہوگیا۔

وفات

۲۱/اپریل ۱۸۶۵ء کو نواب یوسف علی خاں صاحب رام پور کا انتقال ہوجانے پر ان کے بیٹے کلب علی خاں صاحب تخت نشین ہوئے۔ تہنیت کے لئے مرزا صاحب ۱۲/اکتوبر ۱۸۶۵ء کو دوبارہ رام پور پہنچے اور ۲۸/دسمبر ۱۸۶۵ء کو واپس ہوئے۔ انتناءِ راہ میں سردی اور بارش کی وجہ سے علیل ہوگئے اور کئی سال بیمار رہ کر ۱۵/فروری ۱۸۶۹ء بروز دوشنبہ بوقت آٹھ بجے صبح رحلت کی اور بمقام سلطان جی (دہلی) اپنے خُرالی خاندان لوہارو کے قبرستان میں دفن کئے گئے یہ مزار حضرت نظام الدین اولیاء صاحبؒ کی درگاہ شریف کے متّصل ہے۔

3 تصانیف

(۱) ''کلیات نظم فارسی'' قصائد و غزلیات، قطعات و رباعیات اور مثنویات وغیرہ کا بہت بلند مجموعہ ہے۔

(۲) کلیات نثر فارسی

(۳) ''سبد چیں'' میں کچھ فارسی قصائدہ قطعات اور عض فارسی خطوط ہیں۔

خطوط ہیں۔

(۴) ''پنج آہنگ'' میں فارسی انسانہ پردازی کے مختلف نمونے ہیں۔

(۵) ''دیوانِ اردو'' میں بھی تقریباً جملہ اصنافِ سخن موجود ہیں اس مختصر مجموعے کا اردو ادب کی جان سمجھنا چاہیئے۔

(۶) ''اردوئے معلّٰی'' میں اردو کے وہ خطوط ہیں جو مرا صاحب نے اپنے احباب کو لکھے تھے اور جن پر آگے چل کر سادہ و بے تکلف جدید نثر کی بنیاد رکھی گئی۔

(۷) ''عودِ ہندی'' بھی اردو خطوط کا مجموعہ ہے اس میں چند دیباچے اور تقریظیں بھی شامل ہیں۔

(۸) ''قاطع برہان'' یا ''دوفش کا دیانی'' مرزا صاحب نے فارسی کی مشہور کتاب نعات ''برہانِ قاطع'' پر اعتراضات تحریر کر کے ''قاطع برہان'' کے نام سے شائع کئے تھے۔ پھر ایک سال بعد یہی کتاب کچھ ترمیم کر کے ''درنش کا دیانی'' کے نام سے شائع کی۔

(۹) ''تیغِ تیز'' کی وجہ تصنیف یہ ہے کہ مرزا صاحب کی کتاب ''قاطعِ برہان'' شائع ہونے پر مرزا احمد بیگ نے ''موئدالبرہان'' لکھی تھی اس کا جواب غالبؔ نے ''تیغِ تیز'' سے دیا۔

(۱۰) ''نامۂ غالب'' بھی اسی سلسلہ کی ایک اور کتاب ''ساطعِ برہان'' کا جواب ہے۔

(۱۱) ''لطائفِ غیبی'' بھی مباحثہ سے متعلق اور سیف الحق کے فرضی نام سے لکھی گئی تھی۔

(۱۲) ''مہرِ نیمروز'' میں امیر تیمورؔ کے عہد سے شہنشاہ ہمایوںؔ کے زمانہ تک کے تاریخی حالات لکھے تھے۔اس کے بعد شہنشاہ اکبر کے عہد سے بہادر شاہ کے وقت تک کے حالات ''ماہ نیم ماہ'' میں لکھنے کا ارادہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی شروع ہوگئی اور یہ ارادہ پورا نہ ہوسکا۔

(۱۳) ''دستنبو'' میں ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء سے یکم جولائی ۱۸۵۸ء تک دلّی کی تباہی اور اپنی پریشانیوں کی کیفیت قلم بند کی تھی۔

13.4 اقسام کلامِ غالب

(الف) پچیس سال کی عمر تک کا ابتدائی کلام جو انھوں نے خود خارج کر دیا تھا اور اب بڑی تلاش سے فراہم کر کے شائع کیا گیا ہے۔اس مین بیدلؔ، شوکتؔ اور اسیرؔ فارسی گو شعراء کی مازگ کیالی کے تتبّع میں بجائے سادہ و دل نشیں انداز بیان کے مضامین کو تخیل کی پیچیدہ گھاغیوں سے اس طرح گزرا گیا ہے کہ شعر تا بن گیا ہے زبان بھی ایسی استعمال کی گئی ہے کہ ایک آدھ لفظ کے تغیر سے فارسی زبان کا شعر بن جاتا ہے۔ یہ ایک آدھ لفظ اردو کا غالباً اس لئے استعمال کیا گیا کہ شعر کو اردو کہا جا سکے۔ ثقیل فارسی الفاظ نامانوس ترکیبوں اور بندشوں اور معلق خیال آفرینیوں کی کثرت نے شعر میں تاثیر کی جگہ ابہام پیدا کر دیا ہے۔اس قسم کے چند شعر ملاحظہ کیجئے۔

فضائے خندۂ گل تنگ و ذوقِ عیش بے پروا
فراغت گاہ آغوشِ وداعِ دل پسند آیا

عالم جہاں بعرضِ بساط، وجود تھا — جُوں صبح چاکِ جیب مجھے تار و پود تھا

اس طرح کے اشعار میں عجیب و غریب نازک خیالیاں، لطیف تشبہیں، جدید خیالات اور ایک ایک شعر میں مضامین کے بڑے بڑے ذخّار دیا ٹھیں مارتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ بے معنی نہیں مشکل و کم اثر ہیں اور محض اسی لئے خارج کر دیئے گئے تھے۔

(ب) پچیس سال کی عمر سے آخر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کلام میں پایا جاتا ہے اس میں مندرجہ بالا قسم کے صرف دس پندرہ شعر بطور نمونہ چھوڑ دیئے گئے تھے جن سے ارتقائے کلام کا اندازہ بھی ہوسکتا ہے۔ بلحاظ نوعیت کلام غالبؔ کا یہ مشہور و معروف دیوان تین حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔اول ایسے اشعار جو اس زمانے کے عام مذاق کی رعایت سے ان لوگوں کے مند بند کرنے کے لئے لکھے گئے جو سرِ مشارہ بطور تعریض برملا کہا کرتے تھے کہ :

اگر اپنا کہا خود آپ ہی سمجھے، تو کیا سمجھے — مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلامِ میرؔ سمجھے ہم، زبانِ میرزا سمجھے — مگر ان کا کہا، یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

دوم ۔ وہ اشعار جو مولوی فضل حق خیر آبادی وغیرہ مخلص احباب کے پاسِ خاطر سے کہے گئے۔

سوم ۔ وہ کلام جو اپنی پسند کے مطابق کہا گیا۔

(۱) ''عوام پسند اشعار'' جن کے متعلق مرزا صاحب خود فرماتے ہیں۔

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ
کھُلا کہ فائدہ عرضِ ہُنر میں خاک نہیں

ان کا نمونہ ملاحظہ کیجئے :

رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ شرم تم کو مگر نہیں آتی

(۲) ''احباب پسند اشعار'' جن کے بارے میں مرزا صاحب کی مندرجہ ذیل رباعی کچھ اشارہ کرتی ہے۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمایش گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

ان کا نمونہ بھی دیکھئے :

ایک ہنگامہ پہ موقف ہے گھر کی رونق نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

موت کا ایک دن معیّن ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

(۳) ''غالب پسند اشعار'' جنھیں مرزا صاحب خود پسند فرماتے تھے اور جن میں ان کی انفرادیت پوری طرح جلوہ گر ہے اور ان کی جملہ خصوصیات پائی جاتی ہیں یہی وہ حصّہ کلام ہے جس میں مضمون کا ایجاز خیال کی ندرت، زبان کی لطافت، بیان کی سلاست اور آہنگ کی نرمی و دل نشینی پائی جاتی ہے اور اسی سے غالبؔ کو شعرائے اُردو میں قابلِ رشک امتیاز حاصل ہوا ہے۔ یہی غالب کا مخصوص رنگ ہے اس کا نمونہ بھی ملاحظہ فرمائیے :

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لئے ہوئے ہوں شمعِ کُشتہ درخورِ محفل نہیں رہا

نہ لڑ ناصح سے غالبؔ کیا ہوا؟ گر اس نے شدت کی ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

جب وہ جمالِ دل فروزہ عسورت نہر نیمروز آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست لیکن خدا کرے وہ تری جلہ گاہ ہو

یہی وہ حصّہ کلام ہے جو ابتدائی خارج شدہ حصّہ کی ترقی یافتہ صورت کہا جا سکتا ہے، یہی وہ نا خیالیاں ہیں اور وہی نادرہ کاریاں ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ کثرتِ مشق سے زبان و بیان پر قدرتِ تامّہ حاصل ہوگئی ہے۔ اس حصّہ میں اگر بعض اشعار کچھ مشکل بھی نظر آتے ہیں تو وہ معمولی توجہ سے حل ہو جانے پر بڑی حیرت و مسرت پیدا کرتے ہیں۔

13.5 غالبؔ کا مرتبہ بحیثیت شاعر

مرزا صاحب کی ذات میں دہبی شاعر کے غیر محدود تجّر اور فطری مصور کی ہمہ گیر چابکدستی کا اجتماع پایا جاتا ہے۔ غالبؔ اپنے اُردو کلام کو اپنے لئے ننگ سمجھتے تھے چنانچہ فرماتے ہیں :

فارسی ہیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگر راز مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ منست

انھیں اپنی فارسی شاعری پر ناز تھا جس میں وہ ظہوریؔ و نظیریؔ، فیضیؔ و عرفیؔ بیدیؔ اور حسزیںؔ وغیرہ سے کم نہیں تھے۔ پھر بھی اردو دنیا کو انھوں نے وہ لازوال دولت دے دی ہے جس کی گراں قدری کا احساس ہر زمانہ میں اہلِ نظر حضرات کے ہر طبقہ کو دعوت دے رہا ہے رفتار وقت مرزا صاحب کے مرتبہ شناسوں اور قدر دانوں میں ہمیشہ اضافہ کرتی رہی ہے اور ہر دور میں ان کا کلام سرمایۂ دلچسپی اور جولاں گاہِ فکر و نظر رہا ہے۔ اس حقیقی شاعر کے محاسن ذہنِ انسانی کے ارتقا کے ساتھ ساتھ منکشف ہوتے رہیں گے، اردو شاعروں میں غالبؔ ہی وہ شاعر ہے جس کی خوبیوں کا احاطہ آج تک نہیں ہو سکا۔

خصوصیلت و نمونۂ کلام

مرزا صاحب کی نمایاں ترین پانچ خصوصیات نیچے لکھی جاتی ہیں، لیکن ان پر غور کرنے سے قبل دو تین باتیں خوب یاد رکھیئے۔

اوّل یہ کہ ان کی انفرادیت ایک ایک شعر سے پھوٹی پڑتی ہے اور ان کا ہر شعر بغیر کسی کارجی نشان دہی کے خود

پہنچان لیا جا تا ہے۔

دوم یہ کہ غالب اور دوسرے شعراء میں سب سے بڑی وجہ امتیاز یہ ہے کہ ان کے ہاں تمام الفاظ خیالات کے تابع ہوتے ہیں اور دوسروں کے اکثر خیالات الفاظ کے تابع نظر آتے ہیں۔

سوم یہ کہ مرزا صاحب کے اکچرا شعار ایسے پہلو وار ہوتے ہیں جن میں ظاہری مفہوم کے علاوہ اہلِ نظر کو دوسرا لطیف ترینمفہوم بھی ملتا ہے۔

۱۔ کلام غالبؔ کی بنیادی خصوصیت جدّت طرازی ہے۔ مرزا صاحب زندگی کے ہر معاملہ میں اپنی راہ عام روش سے علیٰحدہ رکھنا چاہتے تھے پوشش وملبوس، چال ڈھال، گفتگو، اندازِ تحریر، اسلوب مکتوبات اور آہنگ اشعار میں سے کوئی چیز ایسی نہیں جس سے ان کی مخصوص انفرادیت ظاہر نہ ہو۔ پھر یہ جدّت ایک ایک چیز میں سوسوطرح نمایاں اور کہیں تصنع کا شائبہ نہیں۔ ہر جگہ فطری وقدرتی انداز میں پائی جاتی ہے۔

۲۔ دوسری خصوصیت ہے ذاتی تجربات واحساسات اور جذبات کی اصل مصوری، وہ زیادہ تر آپ بیتی سناتے ہیں۔

۳۔ مرزا صاحب اردو کے پہلے فلسفہ نگار شاعر ہیں اور اس شان سے کہ ہر جگہ ان کے کلام کی شعریت تسفہ کی کشکی و بے گیفی پر غالب نظر آتی ہے۔ شاعر آ حقائق نگاری کلامِ غالبؔ کی تیسری خصوصیت ہے۔

۴۔ چوتھی خصوصیت ہے، نشاطِ غم'' مرزا غالبؔ اپنی مصیبتوں کو بیان کرتے ہیں لیکن اس طرح نہیں کہ سننے والے بدمزہ ہوجائیں۔ برخلاف اِس کے اُن کے کلام سے لذّتِ غم کا احساس ہوتا ہے اور زندگی کے مصائب برداشت کرنے کا دلولہ پیدا ہوجاتا ہے۔

۵۔ سب سے اہم خصوصیت ان کی ہم گیر طنزیہ ظرافت ہے جس کا مقصود محض ہنسنا ہنسانا نہیں بلکہ زندگی کی تلخیوں کو شیریں، گوز بنانا ہے۔ ان کا مزاح محدود نہیں، وہ دوسروں پر بھی طنز کرتے ہیں اور اپنی ذات پر بھی لیکن دل آزاری کا پہلو کبھی پیدا نہیں ہونے دیتے اور ڈسنجیدگی کو ہاتھ سے جانے دیتے ہیں۔ ان کے ہاں تمسخر نہیں ملتا نہ ان کی ظرافت قہقہہ خیز ہے جو ان کے فطری مزاح سے لطف بندوز ہونے کی سلاحیت رکھتے ہیں وہ بس دل ہی دل میں سکرا لیتے ہیں۔ اس قسم کی بے شمار خصوصیتیں کلامِ غالبؔ میں نظر آتی ہیں۔ یہاں صرف انھیں پانچ خصوصیتوں کے تحت بالترتیب تھنڈے تھوڑے اشار بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱) جدّت طرازی

مرزا صاحب کے کلام میں جدّتوں کی حدنہیں۔ تخیّل جدید۔ اسلوب بیان جدید تشبیہات واستعارات، جدید کنایہ وتمثیل جدید۔ الفاظ وتراکیب جدید اور پھر وہ اپنے انوکھے اور جدّت پسند انداز سے معمولی مجامین میں بھی عجیب تازگی پیدا کردیتے تھے چند مثالیں ملاحظہ کیجئے :

جدّتِ خیال و بیان

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبو یا مجھر کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
ذکر اُس پری دش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا
بسکہ مشکل ہے ہر اک کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا
ہوس کو ہے نشاطِ کارکیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا
گرنی تھی ہم پہ برقِ تجسّلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر
سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایا ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہوگئیں
دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

جدّت تشبہات

چھوڑا مہتشب کی طرح دستِ قبا نے
کورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا
غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جزمرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک
ہے مجھے ابر بہاری کا برس کر کھُلنا
روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہوجاتا

جدّتِ استعارات وغیرہ

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
دام ہم موج میں ہے حلقۂ صدکامِ نہنگ

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک

جدّتِ الفاظ وتراکیب

کادش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
ناخن پر قرض اس گرہ، نیم باز کا
نازش ایام خاکتر نشینی کیا کہوں
پہلو اندیشہ وقتِ بستر سنجاب تھا

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

ذاتی جذبات کی اصلی مصوری

غالبؔ اپنے وارداتِ قلب کو اصل شکل میں بڑی خوبی کے ساتھ پیش کر دیتے ہیں۔ ان کے اشعار محض اشعار نہیں ہیں بلکہ ان کے دلی جذبات وخیالات کے حقیقی عکس اور سچّی تصویریں ہیں۔

مہر باں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس دم
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ ہی نہ سکوں
کس منہ سے شکر کیجئے اس لطفِ خاص کا
پُرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں
قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
یارب مجھے زمانہ مٹاتا ہے کس لئے
لوحِ جہاں پہ حرف مکرّر نہیں ہوں میں
نیند اُس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہیں
جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں
ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے　　　کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

کوئی اُمید بر نہیں آتی　　　کوئی صورت نظر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی　　　اب کسی بات پر نہیں آتی

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں　　　کاش پوچھو کہ تدعا کیا ہے

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا　　　دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے

کب وہ سنتا ہے کہانی میری　　　اور پھر وہ بھی زبانی میری

شاعرانہ حقائق نگاری

مرزا صاحب زندگی کے رموز وحقائق ایسی شاعرانہ فلسفیت کے ساتھ منکشف کرتے ہیں کہ فلسفہ کا حق ادا ہو جاتا ہے ورشعریت پر عرف نہیں آنے پاتا :

مِری تعمیر میں مضمر ہے اِک صورت خرابی کی
ہیولٰی برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

جان دی ، دی ہوئی اسی کی تھی　　　حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

عشرتِ مطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا　　　درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

رَد میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

نشاطِ غم

مرزا صاحب کی حسّاس طبیعت کو بڑے بڑے روح فرسا آلام کا سامنا کرنا پڑا ہے، ان مصائب کو جب وہ اشعار مین بیان کرتے ہیں تو دلوں میں نشتروں پر نشتر ٹوٹتے چلے جاتے ہیں لیکن مایوسی وناامیدی پیدا نہیں ہونے پاتی بلکہ مرزا صاحب کا بیانِ غم اکثر دل نگاروں کے لئے مرہمِ تسکین فراہم کرتا ہے :

ان آبلیوں سے پاؤں کے گھبرایا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

قیدِ حیات وبند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

ہم بھی تسلیم کی خُو ڈالیں گے بے نیازی تری عادت ہی سہی

رگوں میں دوڑ نے پھر نے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

طبعی وخلقی ظرافت وطنز

مرزا صاحب کی ایک اہم خصوصیت علم وفضل اور خلوص ودردمندی میں ڈوبی ہوئی ہے نظیر خوش طبعی اور سنجیدہ وطنزیہ مزاح ہے۔جس سے خوشی ہو یا غم، زندگی کے ہر پہلو میں رنگینی ودل کشو پیدا ہوجاتی ہے اور یہ ظریفانہ کیفیت مرزا صاحب کے کلام میں کچھ ایسے علمی وقدرتی انداز کے ساتھ پائی جاتی ہے کہ ان کو بقول خواجہ الطاف حسین حالؔی بجائے حیوانِ ناطق کے حیوانِ ظریف کہیں تو بجا ہوگا۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجئے :

بندگی میں بھی وہ آزادہ وخود میں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِکب اگر دانہ ہوا

یہ مسائلِ تصوّف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو یہ یا وہ خوار ہوتا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

کیا ہی رجواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خُلد میں گزیاد آیا

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اُڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

6 غالبؔ اور تصوف

تصوف ابتدا سے ہی اردو شاعری کا ایک اہم موضوع رہا ہے اور یہ بات بڑی حد تک درست ہے کہ فارسی شاعری کی پیروی اور تقلید میں اردو شاعری بھی تصوف کے بعض پہلوؤں کو بار بار بیان کرتی رہی ہے۔ان میں سب سے اہم پہلو وحدتِ وجود ہے اس عقیدے کے مطابق دنیا کی ساری چیزیں جو موجود معلوم ہوتی ہیں اصل میں موہم ہیں۔اصل ہستی صرف اللہ کی ہے جس کے جلوے سے یہ کائنات روشن ہے۔جو کچھ ہے وہ ایک ذات یعنی اللہ کا جلوہ ہے۔ساری صفتوں کا مرکز اور محور وہی ہے اس لیے وہ دنیا کی ہر شئے میں ہے مگر کوئی بھی

چیز خدائی کا دعوانہیں کرسکتی۔ اس دنیا کی ہر چیز کا مقصد اور اس کی منزل یہ ہے کہ وہ خدا کی ذات میں اپنے آپ کو اس طرح گم کردے جس طرح قطرہ سمندر میں مل جاتا ہے۔ بہرحال اردو شاعری میں تصوف کی جو شکل بار بار پیش ہوتی رہی ہے، وہ یہی ہے، جسے ہم وحدت الوجود کہتے ہیں۔ غالب کے یہاں بھی مختلف اشعار میں وحدت الوجود کے عقیدے کا بار بار ذکر ہوا ہے جس کے سبب ہمیں غالب کے اس دعوی کو ایک حد تک درست مان لینا پڑتا ہے کہ۔

دیکھیو غالب سے گرالجھا کوئی　　　ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

اب سوال یہ ہے کہ غالبؔ کے یہاں تصوف کی نوعیت اور کیفیت کیا ہے؟ اردو شاعری کی دنیا میں ایسے بھی شاعر ملتے ہیں جن کے لیے تصوف ایک مستقل تجربہ ہے اور ایسے شاعروں کی تو خیر کمی نہیں جنھوں نے شاعری کے دوسرے موضوعات کی طرح تصوف کو بھی ایک موضوع مان کر اشعار کہے ہیں۔ جہاں تک غالبؔ کا سوال ہے، یہ بات بار بار کہی جاتی ہے اور بڑی حد تک درست بھی ہے کہ غالبؔ کے لیے تصوف ایک تجربہ نہیں جفلسفہ ہے۔ دوسری طرف غالبؔ نہ تو اپنی وراثت Heridity اور اپنے ماحول (Environment) کے اعتبار سے کسی تصوف کے تجربے سے آشنا ہوئے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ ہندوستان کے پہلے مجہتد مولانا دلدار علی کے خاندان سے غالبؔ کے خاص مراسم تھے اور بظاہر ہر طرح کی مذہبی پابندیوں سے ایک طرح کی بیزاری کا اظہار کرنے کے باوجود غالبؔ شیعہ عقیدہ سے قربت رکھتے تھے۔ شیعوں کے عقیدے میں وحدت وجود کو جو اہمیت حاصل ہے وہ بھی معلوم ومعروف ہے۔ اس کے باوجود حقیقت یہی ہے کہ تصوف کے روحانی تجزیوں سے نہ تو غالبؔ گزرے تھے، نہ ہی انہیں ایسے تجربوں سے کوئی کاص دلچسپی تھی۔ وہ وحدت وجود کو دل سے نہیں ذہنی طور پر مانتے ہیں۔ اس لیے وہ جب ان مسائل کا ذکر چھیڑتے ہیں تو فکر۔۔۔ نمایاں رہتا ہے مگر اس میں جذبے کی اامیزش نہیں ہوتی۔ ان کے وہ اشعر اجو عشق حقیقی سے متعلق ہیں ان میں وہ والہانہ انداز اور جذبے کا خلوص یا جوش وخروش نہیں ملتا ہے جو صوفیوں کی پہچان ہے۔ اس کی خاص وجہ یہی ہے کہ غالبؔ نے تصوف کے بعض سنے سنائے تصورات کو ذہنی طور پر تو قبول کرلیا تھا لیکن دنیا کو ترک کرنے اور ساری دنیاوی لذتوں سے کنارہ کش ہونے کی جو تعلیم صوفی دیتے ہیں اسے غالبؔ عمر بھر تسلیم نہیں کرسکے۔ وہ ہمیشہ گوشت پوشت کے عشق میں بھی مبتلا رہے۔ دنیاوی خواہشوں اور آرزؤں نے عمر بھر ان کپچھا نہیں چھوڑا۔ ایسی صورت مین تصوف ان کے لیے ایک فلسفہ ہی راہا، تجربہ نہیں بن پایا۔

جہاں تک وحدت وجود کے عقیدے سے غالبؔ کی نزدیکی اور قربت کا سوال ہے، ان کے مختلف اشعار کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ وہ خدا کی ذات سے الگ اس پوری دنیا کو موہوم اور بے حقیقت سمجھتے تھے۔ کہتے ہیں :

ہستی کے مت فریب میں آجائیوں اسدؔ
عالم تمام، حلقۂ دام خیال ہے

غالبؔ کے خیال میں خدا اور کائنات کا رشتہ ذات اور صفت کی طرح ہے۔ کوئی بھی صفت اپنے اندر ذات کی خصوصیات رکھ سکتی ہے۔ مگر وہ ذات نہیں بن سکتی۔ گویا ہر شئے میں خدا ہے مگر کوئی شئے خدا نہیں ہے، یہی غالبؔ کا عقیدہ ہے۔ اب جو وہ دریا میں قطرے کو

شامل ہوجانے یا موج کو سمندر میں مل کر فنا ہوجانے کی تعلیم دیتے ہیں، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ اپنی انفرادیت کو ختم کردے بلکہ دریا اور سمندر میں مل کر اسی کی طرح توانائی حاصل کرلے۔

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہوجائے
کام اچھا ہے وہی جس کا مآل اچھا ہے

ان تمام باتون کا خلاصہ یہ ہے کہ غالبؔ نے وحدت وجود کے فلسفے کو اپنی شاعری میں اس کی اپنی شکل میں جگہ دی ہے اور بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ یہ کائنات اور اس کی ساری رنگینیاں محض دھوکا ہیں۔ اصل ذات صرف خدا کی ہے اور باقی تمام چیزوں کی اس سے الگ کوئی حیثیت نہیں۔ گویا غالبؔ کثرت میں وحدت کے قائل ہیں۔ اور ان کے پورے اردو اور فارسی کلام کا مطالعہ کرنے پر ایک یا دو اشعار ضرور ایسے بھی ملتے ہیں جس میں وہ خدا اور بندے کی الگ الگ انفرادیت کی تمنا کرتے ہیں۔ مگر یہ ایک ذہنی کیفیت ہے جو زیادہ دیر تک باقی نہیں رہتی۔ ان کے یہاں وحدت وجود کا رنگ ہی اصل رنگ ہے۔ اور اس سلسلے میں بھی غالبؔ نے عقل سے زیادہ اور جذبے سے کم کام لیا ہے۔

ظاہر کہ غالبؔ کے کلام میں تصوف کے جو عناصر ملتے ہیں، ان میں خاص عنصر وحدت وجود کا عقیدہ ہی ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بھی بعج باتیں ایسی ہیں جنہیں ہم تصوف سے ان کی دلچسپی کا سبب قرار دے سکتے ہیں۔ ایک تو وہی قلندرانہ مزاج ہے جو انہیں ایک خاص طرح کی بے نیازی عطا کرتا ہے۔ دوسرے دنیا کی پیدائش کے بارے مین ان کا نظریہ ہے جو صوفیون کے اس عقیدے سے ملتا جلتا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر کا حسن و جمال اپنے کو ظاہر کرنا چاہتا تھا، اسی لیے دنیا کی تخلیق ہوئی۔ حسن کے اظہار کی تمنا ہی اس کائینات کو عدم سے وجود میں لانے کا سبب بنی۔ ورنہ :

ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

انسان کی عظمت اور بڑائی کو بھی غالبؔ نے تسلیم کیا ہے۔ یہ بات ویسے تو کچھ عجیب سی لگتی ہے کہ ایک طرف تو دنیا کی ساری مخلوقات کو صرف خدا کے حسن کا اظہار قرار دیا جاتا ہے۔ اور دنیا کو بچوں کا کھیل سمجھا جاتا ہے اور دوسری طرف انسان کو اسی طرح بڑا اور فضیلت والا سمجھا جاتا ہے جس طرح اسلامی روایات میں سمجھا گیا ہے۔ غالبؔ کا خیال ہے کہ انسان کا رتبہ دونون دنیاؤں یعنی دنیا اور آخرت دونوں کے مقابلے میں بلند ہے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ انسان کو ایک کے بعد ایک بلند منزل کی تمنا کرنی چاہئے تاکہ اس کے دل میں حرکت اور عمل کا ذوق زندہ رہے اور اس پر سکون جکی حالت نہ طاری ہو۔ اس اعتبار سے غالبؔ کا خیال ویدانت میں پیش کردہ مایا کے نظریے سے الگ ہے ان کی فارسی شاعری میں ایسی بھی بہت سی غزلیں ملتی ہیں جن میں ایک طرف تو خدا کو مالک کل سمجھنے اور اس کی ذات کے آگے اپنے آپ کو مٹا دینے کا سبق ملتا ہے اور دوسری طرف اپنی ایک الگ حیثیت بھی قائم رکھنے کی نصیحت ملتی ہے۔

مختصر یہ کہ غالبؔ کے کلام میں تصوف کے بہت سارے نکتے موجود ہین۔ خاص طور پر انہوں نے وھدت وجود کے نظریے کو اپنے

اردو اور فارسی کلام میں بار بار پیش کیا ہے مگر تصوف غالبؔ کے یہاں ایک فلسفہ ہی رہا ہے تجربہ نہیں بن پایا ہے۔

7 غالب اور اُن کے معاصرین کا موازنہ

(ا) ظفرؔ پہلے ذوقؔ کے شاگرد تھے ان کے مرجانے کے بعد غالبؔ کو اپنا کلام دکھانے لگے، اس لئے وہ تو ان دونوں کے مدِّ مقابل ٹھہرائے نہیں جاسکتے۔اب رہے مومنؔ، ذوقؔ اور غالبؔ ان میں سے مومنؔ کا سب سے بڑا کارنامہ ہے ''ما کاتی'' تغزل ذوق کی اہم خصوصیت ہے۔''صفائے زبان'' اور غالبؔ کے تغزّل کا بیشتر حصّہ مادراتی ہے جس تک مومنؔ کیا کسی کی بھی رسائی نہیں۔ غالبؔ کی عام زبان ذوقؔ کی زبان سے زیادہ فارسی آمیز ضرور ہے۔لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ مرزا صاحب کو زبان پر قدرت حاصل نہیں تھی۔ بلکہ ان کے عمیق خیالات اس سے زیادہ آسان زبان میں بیان نہیں۔ کئے جاسکتے۔ ذوقؔ کی غزلیات میں کوئی عمق نہیں، اس لئے ان کی زبان، ان کے خیالات کے لئے مناسب ہے اور غالبؔ کی زبان غالبؔ کے خیالات کے لئے موزوں ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر بلالحاظ موضوع ومضامین ذوقؔ کے قصائد کی زبان اور غالبؔ کی آسان غزلیات کی زبان کا مقابلہ کیا جائے تو ذوقؔ کی زبان پر فارسیت کا غلبہ نظر آئے گا اور غالبؔ کی زبان خالص اردو ثابت ہوگی۔مثلاً ذوقؔ کہتے ہیں :

جب کہ سرطان واسدمہر کا ٹھہرا مسکن آب دا یلولہ ہوئے نشوونمائے گلشن

وغیرہ وغیرہ اور غالبؔ غرماتے ہیں۔

کوئی امید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی

وغیرہ وغیرہ، غرضکہ مومنؔ، ذوقؔ اور تمام اردو شعرار کے بہترین کلام کا انتخاب اپنی جملہ خوبیوں کے ساتھ تنہا غالبؔ کے مختصرترین دیوان کے مقابلہ میں بہت ہلکا ثابت ہو چکا ہے۔کلامِ غالبؔ مین وہ سب محاسن موجود ہیں جو نہ کسی ایک اُردو، شاعر کے ہاں پائے جاتے ہیں نہ مجموعی طور پر سب کے ہاں ملتے ہیں۔

(ب) غالبؔ کو اپنے ہمعصر یا قریب العہد مغربی شعراء میں بھی امتیاز حاصل ہے۔انگریزی کے مشہور شاعر براؤننگ اور جرمنی کے مشہور الم نگار شاعر ہیں پر بھی فوقیت حاصل ہے۔ کیوں کہ براؤننگ محض تجزیۂ روح کرتا ہے اور اس کے کلام میں فلسفہ کی خشکی اور بے کیفی بھی پائی جاتی ہے اور غالبؔ رموز وحقائق روحانی کا انتہائی شاعرانہ انداز میں انکشاف کرتے ہیں۔ہاں جرمنی شاعر گونے بے شک غالبؔ کا ہمصر غیر معلوم ہوتا ہے۔دونوں میں یکساں طور پر فلسفیوں کی تیزفہمی اور مصوّروں کی حسن کاری پائی جاتی ہے۔

8 خلاصہ

غالبؔ کی غزل گوئی کا جائزہ لیتے ہوئے جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ غالبؔ ایک عبوری دور کے شاعر تھے۔معاشرے مین تبدیلیاں آرہی تھیں اور سیاسی صورت حال کے بدلنے سے تہذیبی قدریں بھی بدل رہی تھیں۔ غالبؔ نے ان تبدیلیوں سے اثرات قبول کرتے ہوئے اردو غزل کو پہلی بار حدیث دلبری کی جگہ 'حکایت زندگی' بنانے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب ہوئے۔غالب کے عہد تک

آتے آتے اردو غزل کے خدوخال متعین ہو چکے تھے اور غالبؔ نے ان روایتوں کا بھی کہیں کہیں ساتھ دیا۔ عشق مجازی اور عشق حقیقی کے مضامین بیان کئے۔ تصوف کے دوسرے پہلوؤں کو بھی برتنے کی کوشش کی۔ معشوق کو دھمکیاں بھی دیں اور اس کے سامنے اپنے عجز کا اظہار بھی کیا۔ مگر ان کی غزل گوئی کا جو سرمایہ تقریباً ڈیڑھ صدی گذر جانے کے باوجود تروتازہ اور مقبول ہے، بامعنی ہے اور نئی تاویلات وتشریحات کے مرحلوں سے گزر رہا ہے، وہ عارض ولب ورخسار اور حسن وعشق کے قصوں سے نہیں بلکہ اپنے عہد کے تغیر اور آشوب سے عبارت ہے۔ ظاہر ہے کہ غالبؔ نے اسلوب کی سطح پر بھی اپنے 'روایت سے انحراف' والے انداز کا ثبوت دیا ہے۔ انہوں نے ایسی ترکیبات اور تشبیہات واستعارت کا استعمال کیا ہے جو نادر ہیں۔ ان کے یہاں معنی کی تہہ داری کا منظر بھی خاصا پریشان کن مگر دلکش ہوتا ہے۔ اپنے شعر کے ہر لفظ کو انہوں نے 'گنجینہ معنی کا طلسم' یونہی نہیں کہا تھا۔ اس لیے ان کے یہاں نئے موضوعات بھی پیش ہوئے ہیں اور پرانے مضامین بھی نئے انداز اور نئے تیور کے ساتھ باندھے گئے ہیں۔ دوسری طرف پرانے اسالیب کو پوری طرح ترک نہیں کیا گیا ہے مگر نئے شعری لوازمات کا استعمال کثرت سے ہوا ہے۔ دراصل روایت سے یہی انحراف غالبؔ کی توانائی بھی ہے اور زیبائی بھی۔ اسی کی بنیاد پر لوگوں نے غالبؔ کا کلام سمجھنے میں اپنی لاچاری کا اظہار بھی کیا تھا اور خود غالبؔ نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ :

میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

اس لیے جب تک اردو شعروادب کی تفہیم وترویج کا سلسلہ جاری رہے گا غالبؔ کے اشعار نئی جہتوں سے آشنا ہوتے رہیں گے۔ یہی غالبؔ کی انفرادیت اور ان کی عظمت کا سبب ہے۔

9 مشق کے لئے سوالات

۱۔ غالبؔ کے عہد اور ان کی شاعری سے اپنی واقفیت ظاہر کیجئے۔

۲۔ غالبؔ کی غزل گوئی کے امتیازات مثالوں کے ساتھ واضح کیجئے۔

۳۔ غالبؔ کی عظمت کے اسباب بتائیے۔

۴۔ غالبؔ کی شاعری میں تصوف کے عناصر کا جائزہ لیجئے۔

10 مزید مطالعہ کے لئے کتابیں

۱۔ غالبؔ، شخص اور شاعر ۔ مجنوں گورکھپوری

۲۔ غالبؔ کی شخصیت اور شاعری ۔ رشید احمد صدیقی

۳۔ گفتار غالبؔ ۔ مالک رام

۴۔ تلاش غالبؔ ۔ نثار احمد فاروقی

۵۔ غالبؔ کی شناخت ۔ کمال احمد صدیقی

۶۔ غالبؔ اور انقلاب ۱۸۵۷ء ۔ معین الرحمن

۷۔ غالبؔ ایک نظر میں ۔ فضل حسین